© rasailojaraid.com

عیسائی مبلغین کی شہروں سے سراسیمگی اور فرار کی وجہ ان کا تکلیف دہ، پیچیدہ اور وسیع و عریض پھیلاؤ اور خوف اور بے یقینی سے معمور فضا ہے۔ تاہم شہر ہی وہ مقام ہے جہاں دنیا کی سب سے زیادہ آبادی رہتی ہے اور ان سے لاتعلقی کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ ہمیں لوگوں کی پرواہ نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ بیروزگاری، ناگفتہ بہ طبّی سہولتیں، ناکافی رہائش اور گھٹیا معیارِ تعلیم جیسے مسائل شہروں میں مغربی عیسائیت کے اثرات مرتب نہ کرسکنے کا بنیادی سبب ہیں۔ بہت سے عیسائی عموماً یہ کہتے ہیں کہ "یہ تمام باتیں زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ لیکن ان کا تعلیمات مقدس سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو سماجی مسائل ہیں"

"جبکہ اسلام ان مسائل کو بذاتِ خود اہم گردانتا ہے۔ وہ اپنے مذہبی پیغام کے سماجی اثرات کا فروغ چاہتا ہے اور اس کے لیے سماجی ایجنڈے کی مکمل تیاری کے ساتھ آگے کی جانب پیش قدمی کرتا ہے۔ مسٹر ڈگلس اس ضمن میں مصر کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جہاں اخوان المسلمون نے (جو کہ ایک بنیاد پرست تنظیم ہے اور پورے مشرق وسطیٰ اور کئی دیگر مقامات پر سرگرمِ عمل ہے) اسٹور فرنٹ (STORE FRONT) طبّی کلینک کھول رکھے ہیں۔ ان کلینکوں میں سرکاری ہسپتالوں کے مقابلے میں جہاں عوام کا بے پناہ ہجوم رہتا ہے، علاج معالجے کی متبادل سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنا چاہیے کہ شہروں میں جس قسم کے مسائل موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ کا سامنا کرنے کے لیے ہم اپنے لوگوں کو وہاں کام کرنے پر کس طرح تیار کرسکتے ہیں۔

(رپورٹ۔ چیلنج ویکلی)

مشرقِ وسطیٰ

اسرائیلی فلسطینی تنازعہ: علاقائی مجموعی سیاسی صورتِ حال پر منفی اثرات

مسٹر غزہ ربیض (GHASSA RUBEIZ) جینوا میں ورلڈ کونسل آف چرچز کے معاون سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ اکومینکل پریس سروس میں چھپنے والے ان کے ایک طویل مضمون کے اقتباسات یہاں شائع کیے جارہے ہیں۔

مقبوضہ علاقوں کی موجودہ صورتِ حال تکلیف دہ حد تک ناقابلِ تغیر نظر آتی ہے۔ خبروں میں بھی یکسانیت کا رنگ برقرار ہے۔ لیکن حالات کے اس جمود میں سست رو تبدیلی کی ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مخفی لہر موجود ہے جو کسی وقت بھی تشدّد میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے۔ 1948ء میں ریاست اسرائیل کے قیام کے بعد سے ہر عشرے میں عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان ایک بڑی جنگ لڑی گئی۔ فی الوقت کسی ناقابلِ یقین تبدیلی کا خوف پایا جاتا ہے اور ہر فریق حالات کے رخ کو اپنی خواہشات اور تصوّرات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں ہے تاہم دونوں فریق ابھی تک اتنے طاقتور ضرور ہیں کہ وہ برق رفتار تبدیلی کو روک سکیں۔ اسرائیلیوں کو فوجی قوّت میں برتری حاصل ہے۔ جبکہ فلسطینیوں کو زمین کے بدلے امن کے سوال پر ملّی اتحاد، عزم صمیم اور تقریباً تمام عالمی رائے عامّہ کی تائید میسر ہے۔

مقبوضہ علاقوں میں سخت رسّہ کشی کی سی صورت حال میں اپنی اپنی بقا کا خوف دونوں جانب موجود ہے۔ ایک طرف اسرائیلیوں کو اپنی مکمل تباہی کا ڈر لاحق ہے۔ جبکہ فلسطینی اس کے برعکس اپنی سرزمین سے اخراج اور جنگوں میں قتلِ عام کے خوف میں مبتلا ہیں۔ حالیہ برسوں میں فلسطینیوں نے یہودیوں کے اعصاب پر سوار عام تباہی (HOLOCAUST) کی دہشت کو تسلیم کیا ہے اور انہوں نے اس سے سیاسی اور اخلاقی طریقوں سے نبٹنا شروع کیا ہے۔ انتفاضہ کے آغاز سے فلسطینیوں نے اسرائیل کے وجود کا اقرار، تشدّد سے برأت اور ایک محدود علاقے میں اپنی ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اسرائیلی ثقافت کے کچھ پہلوؤں کو بھی اپنایا ہے۔ مقدّس سرزمین میں تعلیم یافتہ فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے باہمی روّیوں میں حالیہ ہم آہنگی اس سے کہیں زیادہ ہے جو فلسطینیوں اور دیگر عربوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔

اسرائیلی البتہ فلسطینیوں کو اپنی ہمسائیگی میں قبول کرنے پر نفسیاتی طور پر ابھی تک تیار نہیں ہوسکے اور نہ وہ انہیں کسی قسم کی رعایت دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان کی نظروں میں پہلے عرب اور اس کے بعد فلسطینی ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فلسطینی پہلے فلسطینی اور اس کے بعد عرب ہیں۔ اگر اسرائیلی فلسطینیوں کی جانب امداد اور تعاون کا ہاتھ بڑھائیں تو اس علاقے میں ان کے اس اقدام سے ایک نئے جمہوری دور کا آغاز ہوسکتا ہے اور دو ہمسایہ جمہوری ریاستوں کے استحکام سے دوسرے ملکوں میں جمہوریت کے امکانات روشن ہوسکتے ہیں۔ ان ملکوں میں سرفہرست لبنان ہے۔ اس کے بعد اردن اور اسی طرح دوسرے ملک ہیں۔

کیا انتفاضہ اسرائیلیوں اور فلسطینیوں کے درمیان مستقبل میں اشتراکِ عمل کے لیے اخلاقی چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے؟ کیا اس سے فریقین کو اعتدال پسندانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریک ہوسکتی ہے؟ کیا یہ امن کی تلاش کے لیے حقیقت پر مبنی قوت ہے؟ اپنی سیاسی اور فوجی طاقت سے قطع نظر، اسرائیلی مستقبل کے لیے اس علاقے کی منصوبہ بندی کے سلسلے میں محتاط اور مدافعانہ پالیسی اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ اس علاقے میں، جو عربوں اور مسلمانوں کی غالب اکثریت کا علاقہ ہے، اقلیت میں ہیں۔ اقتصادی اور فوجی محاذ پر غیر معمولی کامیابی کے باوجود وہ اپنے حالات کو ابھی تک معمول پر نہیں لاسکے۔ اس سوال نے اسرائیلیوں کو ابھی تک پریشان کر رکھا ہے کہ علاقے میں ان کی کس انداز کی موجودگی سے ان کی مستقبل کی نسلوں کو پائیدار تحفظ میسّر آسکتا ہے۔

اسرائیلیوں کا اصرار بہرحال یہ ہے کہ ایسے خطے میں رہتے ہوئے جسے مخالف عرب دنیا نے گھیر رکھا ہے طاقت ہی بہترین دفاعی حکمت عملی ہوسکتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک عرب ممالک بھی اسی پالیسی پر عمل پیرا رہے۔ جس کا نتیجہ سلامتی کے نام پر تباہ کن جنگوں کے ایک سلسلے، مسلسل کشیدگی اور خطرناک ہتھیاروں کی ذخیرہ اندوزی کی صورت میں برآمد ہوا۔

انتفاضہ (جس کے نزدیک دو ریاستوں کے قیام ہی سے امن بحال ہوسکتا ہے) کا جب سے آغاز ہوا ہے علاقے میں سلامتی اور تحفظ کی ایک نئی زبان نے جنم لیا ہے۔ جس کا نعرہ ہے جیو اور جینے دو۔ اسرائیلیوں کو اس نعرے کے ذریعے ایک متبادل دفاعی ماڈل کی پیشکش کی گئی ہے۔ جو "دیواروں" کی تعمیر کی بجائے اچھی ہمسائیگی کے ذریعے دفاع کے حصول کے نظریے پر مشتمل ہے۔ اسرائیلی حکومت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ گرد و نواح کی ریاستوں کے ساتھ متوقع جنگوں کی صورت میں اسرائیل کے دفاع کے لیے مقبوضہ علاقے اہم حربی حیثیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس کی نظروں میں افراد کی بجائے مقبوضہ سرزمین زیادہ اہم ہے جبکہ مغربی کنارے، مشرقی یروشلم اور غزہ کے علاقے میں آباد 15 لاکھ فلسطینی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ یوں اسرائیل کے موجودہ سیاسی رہنماؤں نے سلامتی کے لیے طاقت کی اوّلین ترجیح کے سوال کو کافی حد تک موضوع بحث بنایا اسی طرز کے سوال کا سامنا لبنان کی ایک سرکردہ عیسائی اقلیت مارونی (MORONITE) کو اس وقت کرنا پڑا جب 1975ء میں انہیں بھی لبنان میں کچھ ایسے ہی ناراض ہمسایوں سے واسطہ پڑا۔ مارونی رہنماؤں نے بد قسمتی سے خیال یہ کیا کہ ان کا مستقبل اچھی ہمسائیگی کی بجائے "دیواریں" کھڑی کرنے سے زیادہ محفوظ ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی فوجی قوّت میں اضافہ کیا۔ زمینوں پر قبضہ کیا اور اسرائیل کے رہنما مسٹر شیرون کے ساتھ اپنا اتحاد قائم کیا۔ جو فوجی طاقت میں اضافے کے ذریعے دفاع کے نظریے کا قائل ہے۔

© rasailojaraid.com